اسوۂ حسنہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں

عبدالقدیر سلیم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے مواہب و عطیات سے سرفراز فرما کر اسے روئے زمین کی ساری مخلوقات پر شرف بخشا۔ ان میں سے بعض عطیات کا تعلق مادی حواس سے ہے اور بعض کا ذہنی قوئی سے' اور بعض کا قلبی و روحانی قوت سے۔ پھر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مادی حواس کا رابطہ باطنی قوتوں سے جوڑ دیا۔ ان حواس یا محسوسات میں ایک بڑی قوت' قوتِ ناطقہ ہے جس کے ذریعے انسان نے متنوع انقلابی کارنامے انجام دیے ہیں۔

روئے زمین کا ہر خطہ طبعی وجوہ کی بنا پر ایک منفرد زبان کی قوت رکھتا ہے۔ چنانچہ یونانی' لاطینی' آریائی اور سامی زبانیں جو انسانی تہذیب کی تاریخ میں شہرت رکھتی ہیں' اپنے اپنے دور میں اپنے آثار چھوڑ گئی ہیں۔

سامی زبانوں میں ترقی یافتہ اور زندہ زبان عربی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ایک بے آب و گیاہ اور تمدن سے ناآشنا ریگستانی خطے میں ایسی زبان پیدا ہوئی اور نشوونما پا کر اس قدر وسیع بن گئی کہ اس کے لفظی ذخیرے میں مختلف چیزوں کے نام' اقسام واوصاف کے فرق کی وجہ سے سیکڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً شہد کے لیے پانچ سو' اونٹ اور شراب کے ہزار ہزار اور مختلف قسم کی تلواروں کے لیے چار ہزار اسماء ہیں۔ یہ وسعت دنیا کی کسی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ دورِ جاہلیت میں بڑے بڑے زور آور و قادرالکلام شاعر اور خطیب پیدا ہوئے' جن کی زبان کسی رسمی درس گاہ کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ انھیں فخر تھا کہ وہ عرب (یعنی فصیح و قادر الکلام)' اور غیر عرب' عجمی (یعنی ژولیدہ بیان) ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسی زبان کو پروان چڑھایا تاکہ اس میں اس کی آخری کتاب' قرآن نازل ہو سکے' جو نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہو' اور تاقیامت باقی رہ سکے۔ پھر اس کا نزول اس خاتم الرسل پر ہو جو جامع محامد و اوصاف ہونے کے لحاظ سے ایک زندہ معجزہ ہو۔ چنانچہ جس طرح قرآن مجید ایک عدیم المثال معجزہ ہے' اسی طرح قرآن کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خطابت بھی تمام لوازم خطابت کے ساتھ بے مثل ہے۔

محمد سلیم عبداللہ

(۱)

خطابت کی اہمیت

ایک انسان سے دوسرے انسانوں تک ابلاغ و ترسیل خیالات و جذبات کا قدیم ترین طریقہ خطابت ہے۔ دراصل انسان کو روئے زمین کی دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرنے والی صفت' یہی اس کا نطق ہے' جس کی بنا پر اسے "حیوانِ ناطق" کہا جاتا ہے۔ کرۂ ارض پر اپنے وجود کے کئی لاکھ سال انسان نے یوں گزارے کہ اس کے پاس ابلاغ کے لیے اشاروں اور گفتگو کے سوا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ تحریر کی ابتدا انسانی تاریخ کا ایک حالیہ واقعہ ہے' یعنی اب سے صرف چند ہزار سال پہلے انسانوں نے اپنی "گفتگو" کو مرئی نشانات اور علامتوں کے ذریعے مرتسم اور محفوظ کرنے کا ڈھنگ اور فن' ایجاد کیا۔ لیکن ان چند ہزار سالوں میں بھی تحریر' خیالات کی اشاعت کا بہت موثر اور وسیع الاستعمال ذریعہ ہی نہیں رہی' کیونکہ خواندگی کا تناسب بہت ہی حقیر تھا۔ کم ہی لوگ پڑھ سکتے تھے' اور شاید ان سے بھی کم کو لکھنا آتا تھا۔ پھر وسائلِ تحریر اور سامانِ کتابت پر نظر ڈالیں تو تحریر کے تنگ دائرے پر کوئی تعجب بھی نہیں ہوتا تھا۔

قدیم مصریوں نے جو تصویری خط (Hieroglyph) ایجاد کیا' اس کے نمونے اہرام مصر کی دیواروں پر کندہ یا منقوش ملتے ہیں۔ بعد میں صوتی علامات بن گئے اور حروف و الفاظ نے مرئی شکل اختیار کی۔ سائرائی اقوام (Sirites) جو جزیرہ نما سینا میں آباد تھیں' غالباً فنِ تحریر کی موجد ہیں۔ انھی نے صوتی حروف ایجاد کیے۔ انھی حروف کو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ فینیقیوں (Phoenicians) نے اور پھر دوسری اقوام نے اختیار کیا۔ قدیم عبرانی نے' جو عربی زبان کی ماں ہے' اور سامی الاصل زبان ہے' غالباً اسی تحریر سے نشوونما پائی تھی۔[۱]

کاغذ' اہلِ چین نے دوسری صدی عیسوی کے پہلے عشرے ہی میں ایجاد کیا۔ گویا یہ بہت ہی حال کی ایجاد ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ وسائل تحریر بہت کم یاب تھے' لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد قدیم تہذیبی ادوار میں بھی بہت کم رہی ہے۔[۲] پھر طباعت کی ایجاد اور تحریر شدہ مواد کی اشاعت کثیر نے نہ صرف یہ ممکن بنا دیا کہ انسانی فکر کی اشاعت بہت کم وقت میں نہایت وسیع طور پر ہو جائے' بلکہ اسے محفوظ رکھنا بھی زیادہ آسان ہوگیا۔ تحریر کے یہ دو بڑے فائدے ہیں : ابلاغِ وسیع اور تحفیظِ فکر و خیال۔ پھر برقی' کہربائی ایجادات و فنیات نے اس سمت میں جو انقلاب برپا کیا ہے' اس نے حرف و صوت' آہنگ اور بصری و صوری ارتسامات کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

لیکن اگر غور کریں' تو یہ ساری فنیات' خیال و فکر کی ترسیل کے ذرائع اور مقاصد ہی کے

گرد گھومتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسروں تک اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے گفتگو کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی' آج بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے' یہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و احسان ہے' اسی لیے تو فرمایا ہے کہ "... اس نے انسان کی تخلیق کی' پھر اسے بیان' (یعنی اظہار خیال کا اسلوب) سکھایا" (الرحمٰن ۵۵ : ۴)۔

اس اہمیت کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ تحریر عموماً غیر شخصی اور غیر ذاتی ہوتی ہے' جبکہ تقریر اور گفتگو میں متکلم اور مخاطب کے درمیان بلاواسطہ شخصی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے جن ملکوں میں خواندگی تقریباً سو فیصد ہے' وہاں بھی سیاسی کارکن' مبلغ' انقلابی' مصلح اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے قائدین نے عوام سے رابطے کے ذریعے کو فراموش نہیں کیا ہے۔ موثر گفتگو اور کلام ("بیان") زندگی کے بہت سے شعبوں میں کامیابی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

مگر دل نشین اور پر تاثیر گفتگو اور خطابت ایک فن بھی ہے۔ دوسرے فنون کی طرح یہ بھی ایک خداداد عطیہ ہے' اگرچہ شعوری کوشش' محنت اور تربیت سے ایک شخص اپنے اظہار کو زیادہ موثر اور بہتر بنا سکتا ہے۔۳

(۲)

زبان کا مؤثر استعمال

خطابت' زبان کے موثر اور خوبصورت استعمال کو کہتے ہیں۔ ایک اچھا مقرر یا خطیب نہ صرف زبان پر پورا پورا عبور رکھتا ہے' بلکہ اسے الفاظ کے انتخاب اور برمحل استعمال کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ ایک ہی معنی کے اظہار کے لیے مختلف متبادل الفاظ ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب' کلام میں حسن و تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ تشبیہ' استعارے اور حکایت یا تمثیل کا استعمال' جوش اور سکون' موقعہ کی مناسبت سے سامعین کے جذبات' عقل سے اپیل' آواز کا اتار چڑھاؤ' حرکات و سکنات اور اشارے' ایک اچھے خطیب کے کلام کو جادو بنا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کلام سحرانگیز ہوتا ہے۔

(۳)

انسانی کلام کی معراج

حضورؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے خطے اور ایسے عہد میں مبعوث ہوئے' جہاں

حسنِ بیان، فصاحت، ابلاغ اور خطابت کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ نہ صرف افراد، بلکہ بعض پورے پورے قبائل کو اپنی زبان دانی اور سخن طرازی کا گھمنڈ تھا۔ اس عہد اور ماحول کا یہ خصوصی تقاضا بھی تھا کہ آپؐ میں کلام اور ابلاغ کی صفات بدرجہ اتم موجود ہوں۔ پھر آپؐ کے مشن کا عمومی تقاضا بھی یہی تھا کہ آپؐ کا کلام، انسانی کلام کی معراج ہو۔ نہ صرف اپنے عہد کے لیے، بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے کلام ہی وہ وسیلہ تھا، جس کے ذریعے آپؐ کو ایک پوری قوم کے عقائد، تصورات اور نتیجتاً زندگی میں ایک کلی انقلاب برپا کرنا تھا، اور ایک ایسی امت تشکیل دینی تھی، جو ایک عالمی انقلاب کی راہ ہموار کرسکے۔ آپؐ کو "فصیح ترین عرب" کہا گیا۔ بجا طور پر آپ فصیح ترین انسان تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام سیرت نگار اس امر میں متفق ہیں کہ آپؐ کی گفتگو نہایت دل نشین اور موثر ہوا کرتی تھی۔ مکہ میں آپؐ کے بہت سے مخالفین آپؐ کو دیکھ کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ مبادا آپؐ کا کلام کانوں سے ہوتا ہوا دل میں اتر جائے۔ آپؐ نے دعویٰ کیا کہ "انا افصح العرب و العجم" --- یعنی میں عرب و عجم میں سب سے زیادہ فصیح اللسان ہوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ و آثار، اور حدیث و روایت میں آپؐ کا جو کلام محفوظ رہ گیا ہے، وہ اپنی جامعیت، معنی آفرینی، اختصار، صحت اظہار، قادر الکلامی، انتخاب الفاظ اور تاثیر میں بے مثل ہے۔

آپؐ کے ہم عصر عربوں کو اپنی قادرالکلامی اور فصاحت کا ایسا گھمنڈ تھا کہ اپنے مقابلے میں دوسری اقوام کو "عجم" یعنی عاجز الکلام کہتے تھے۔ میلوں، ٹھیلوں، مذہبی تقریبات اور خصوصاً حج کے موقعے پر مختلف قبیلوں کے شاعر اور خطیب، عام مجمعوں میں اپنی شاعری کے سحر اور خطابت کے جلوہ جگاتے تھے، اپنے آباء و اجداد کی عظمت کے گیت گاتے، اپنی شجاعت، سخاوت، عاشقی اور توانائی کی داستانیں چھیڑتے، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر داد فصاحت دیتے، اور خراج سماعت وصول کرتے تھے۔ قرآن مجید میں مناسک حج میں عرب جاہلیت کے اسی دستور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ ۲:۲۰۰)

جب تم حج کے ارکان پورے کرچکو، تو اب اللہ کا ذکر اسی طرح کیا کرو، جس طرح تم اپنے آباء و اجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

فصاحت اور قادرالکلامی سے عربوں کے شغف کے بارے میں استاذ احمد زیات کہتے ہیں:

عرب... بچپن ہی سے اپنے بچوں کی تربیت میں خطابت کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ ہر قبیلہ میں ایک مقرر (خطیب) اور ایک شاعر ہو' جو ان کی تقویت کا باعث اور ان کا ذکر بلند کرنے کا سبب ہو۔ چنانچہ کبھی کبھی یہ دونوں صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو جاتی تھیں۔

اپنی تقریروں میں وہ دل نشین اسلوب' سحربیانی' سلیس عبارت' خوش نما الفاظ' صاف صاف باتیں' چھوٹے چھوٹے مسجع جملے اور زیادہ ضرب الامثال استعمال کرتے تھے۔ مضمون ذہن نشین کرانے اور ہر دل عزیز بنانے کے لیے تقریروں میں اختصار کو مدنظر رکھتے تھے۔ عربوں میں دستور تھا کہ مقرر اونچی جگہ کھڑے ہو کر' یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا' اثنائے تقریر میں ہاتھ ہلاتا' مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا۔ ہاتھ میں عصا یا نیزہ اور تلوار کا سہارا لیتا' یا ان سے اشارہ کرنا بھی ان کے یہاں رائج تھا۔

وہ مقرر ان میں درجہ قبولیت حاصل کرتا' جو خوش وضع و خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بلند آواز' خوش بیان' دلیر اور بے باک ہوتا۔ زمانہ جاہلیت میں ان کے مشہور قابلِ ذکر مقررین قیس بن ساعدہ الایادی' عمرو بن کلثوم التغلبی' اکثم بن صیفی التمیمی' حارث بن عباد البکری' قیس بن زہیر العبسی' عمرو بن معدی کرب الزبیدی تھے۔۵۔

عرب کے ان بڑے مقرروں میں قیس بن ساعدہ الایادی' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم عصر تھا۔ یہ نجران کا عیسائی پادری' عالم اور فلسفی تھا۔ کہتے ہیں کہ بالالتزام بلند جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے' تیز تلوار کا سہارا لینے اور خطبہ میں "اما بعد" کہنے کی ابتدا اسی نے کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عکاظ کے اجتماع میں اس کی تقریر سنی اور پسند فرمائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا "خدا قیس پر رحم فرمائے' مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن وہ تنہا ایک قوم کی جگہ اٹھایا جائے گا" ۶۔ اس سے منسوب جو نثر ملتی ہے' وہ دل کش اور پراثر ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور تغیراتِ عالم سے عبرت' اس کا خاص موضوع ہے۔

عطیہ خداوندی

اس پس منظر میں قرآنِ مجید اور حدیثِ قدسی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ پاک ۵۷۱ء (۵۳ ق ھ) میں ہوئی۔ آپؐ کا مولد (مکہ) قدیم عرب کا بھی مقدس ترین شہر' اور سارے عربوں کی زیارت گاہ تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے' عرب کا سب سے بڑا اجتماع اس زمانے میں بھی حج کے موسم میں ہوتا تھا۔ دور اور نزدیک سے ہزاروں انسان وہاں پہنچتے اور

مناسکِ حج اور تجارت کے ساتھ ساتھ تفریح اور تفاخر کے طور پر شعر اور سخن طرازی کی محفلیں بھی گرم ہوتیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً ان مجالس کے مشاہدے کے تجربے ہوئے ہوں گے۔ تاہم تاریخ میں کسی ایسی شخصیت کا سراغ نہیں ملتا، جس سے آپؐ نے کسب علم کیا ہو، یا جس کی محفل میں شریک ہوئے ہوں، یا صحبت اٹھائی ہو۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ آپؐ کے ہم عصر مخالفین بھی کسی ایسے شخص کی نشاندہی نہیں کرسکے جس سے آپؐ نے زبان دانی اور دانش میں فیض پایا ہو، کیوں کہ ایسے کسی شخص کا وجود تھا ہی نہیں۔ تبلیغِ اسلام کے ابتدائی دور، قیامِ مکہ کے زمانے میں مشرکینِ مکہ نے البتہ آپؐ پر یہ الزام لگایا تھا کہ قدیم تاریخ اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں آپؐ کا علم، بعض دوسرے لوگوں سے ماخوذ ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (النحل ۱۶: ۱۰۳)

ہمیں یہ بات یقیناً معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے تو ایک انسان سکھاتا پڑھاتا ہے۔ جس کی طرف یہ سکھانے کی نسبت کرتے ہیں، اس کی زبان تو عجمی ہے، جب کہ یہ صاف عربی زبان ہے۔

معاصر مشرکین (اور بعد کے بعض غیر مسلم "محققین") نے آپؐ کی طرف جن "معلمین" کی نسبت کی ہے، وہ سب غیر عربی، رومی یا عجمی غلام تھے۔ ان میں سے ایک صاحب حویطب بن عبدالعزیٰ کے غلام تھے، جن کا نام عائش یا یعیش تھا۔ یہ اسلام لے آئے تھے، اور اچھے مسلمان تھے، یہ قدیم مذہبی کتب بھی پڑھا کرتے تھے اور یوں عرب کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو پڑھنا جانتے تھے۔ پھر کسی نے عامر بن الحضرمی کے غلام جبر کا نام لیا اور کسی نے یسار نامی غلام کو بھی انہی "معلمین" کی فہرست میں شامل کیا۔ موخر الذکر دونوں رومی غلام تھے، اور مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے۔ یہ تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے تھے۔ گویا عیسائی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوتا تو آپؐ ٹھہر جاتے اور سنتے۔ بعض نے سلمان فارسیؓ کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ یہ بھی ایرانی غلام تھے۔ ۳

یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ سارے لوگ جن پر مخالفین نے آپؐ کے معلم ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے، غیر عربی، غلام یعنی دوسرے درجے کے شہری تھے۔ اصل بات یہ ہے دعوت کے ابتدائی دور میں اس کی قبولیت اور پذیرائی سب سے زیادہ جس طبقے میں ہوئی، وہ یہی مظلوم کچلے ہوئے لوگ تھے، نہ کہ امراء و مترفین، اور یہ لوگ تو پڑھے لکھے بھی تھے، اس لیے آپؐ کا ان پر توجہ دینا

یقیناً فطری امر ہوگا' جسے مخالفین نے ایک دوسرا ہی رنگ دے دیا۔

ان لوگوں کی طرف معلم ہونے کی نسبت کئی وجوہ سے لغو اور ناقابلِ قیاس ہے۔ پہلی دلیل تو وہی ہے' جو قرآن مجید نے خود دی ہے کہ ان سب کی زبان عجمی تھی' جبکہ قرآن کی زبان بہترین عربی ہے' جو ہمیشہ کے لیے عربی زبان کی فصاحت کا معیار بن گئی ہے۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایسے لوگ' جو خود آپؐ کو سکھاتے پڑھاتے ہوں' آپؐ پر ایمان کس طرح لا سکتے تھے؟ یہ تمام لوگ' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' عربوں کے سماجی اور معاشی نظام میں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' اور اپنے نئے دین کی خاطر انھوں نے اپنے آقاؤں کی ناراضگی مول لے لی تھی۔ جو شخص انھی کی مہیا کی ہوئی معلومات کو اپنا الہام بنا کر پیش کر رہا ہو' اس کی خاطر وہ آلام و مصائب کیوں برداشت کرتے؟ یہ مسلمان جن دکھوں اور تکلیفوں سے گزرتے تھے' انھوں نے ان کے اخلاص پر تو ضرور مہر لگا دی تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں اور جو کچھ بھی کہا جائے' انھیں افترا کرنے والا یا افترا میں حصہ لینے والا کوئی نہیں کہہ سکتا۔۸ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ خود شہادت دیں کہ ہم تو خود آپؐ سے سیکھتے ہیں۔۹

حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف آپؐ کی تعلیمات اور ان کے فکری مشمولات' بلکہ فصاحت' زبان دانی اور خطابت' سب عطیۂ خداوندی تھیں۔ اور اس لحاظ سے بلاشبہ آپؐ تلمیذ الرحمٰن تھے۔ زبان پر قدرت کے تو سب مادی اسباب بھی مہیا تھے' مثلاً یہ کہ آپؐ قریش کے خاندان بنو ہاشم میں پیدا ہوئے تھے' جن کی عربی' سارے عرب میں معیاری زبان شمار ہوتی تھی۔ آپؐ کا ننھیال بنی زہرہ میں تھا' آپؐ کا بچپن بنی سعد میں گزرا تھا' اور یہیں آپؐ نے دودھ پیا تھا' اس لیے آپؐ کی زبان پر ان کا بھی اثر تھا۔ آپؐ کی شادی بنی اسد میں ہوئی (حضرت خدیجہؓ) اور مہاجرت بنی عمرو (اوس و خزرج) میں۔ ان سارے قبیلوں کی عربی معیاری تھی۔ بنی سعد بن بکر' جہاں آپؐ کی ابتدائی پرورش ہوئی' علیا ہوازن میں شمار ہوتے تھے' اور یہ عرب کے فصیح ترین قبائل کہلاتے تھے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ "میں عرب کا سب سے زیادہ فصیح البیان ہوں' اس لیے کہ میں قریشی ہوں' اور بنی سعد میں پلا ہوں۔" لیکن آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات اور مجوزہ نظامِ حیات کے لیے ایسے دنیاوی مصادر بھی نہیں ملتے جہاں سے کسبِ فیض کا شبہ کیا جاسکے۔(جاری)

حوالے:

۱- حال کے بعض محققین کی رائے کچھ مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دراصل قدیم عربی' عبرانی زبان کی ماں

ہے۔ عبرانی، عربی ہی کی ایک شاخ ہے۔

۲۔ اس حقیقت کا اعتراف غیر مسلم مورخین نے بھی کیا ہے کہ بڑے پیمانے پر عوام کو نوشت و خواند سے آشنا کرنے کا کام مسلمانوں ہی نے کیا۔ اگرچہ چھٹی صدی عیسوی میں چین میں کاغذ کا رواج ہو چکا تھا، تاہم مغربی ایشیا اور یورپ میں کاغذ کا تعارف آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوا۔

۳۔ قدیم مغرب کے عظیم ترین مقرر ڈیما ستھینز (Demosthenes) م ۳۲۲ ق م، کی زبان میں لکنت تھی۔ مقدونیہ کے شاہ فلپ نے اس کے شہر ایتھنز پر قبضہ کیا تو یہ عاجز بیان عام شہری اسے برداشت نہ کر سکا۔ وہ منہ میں کنکریے ڈال کر سمندر کے کنارے گھنٹوں تقریر کی مشق کرتا۔ قدیم کلاسیکی ادب پر عبور حاصل کرنے کے لیے اس نے ان ادب پاروں کو تقریباً حفظ کر لیا تھا اور پھر اپنی خطابت سے اس نے شاہ فلپ کے خلاف ایتھنز کے شہریوں میں آگ لگا دی تھی۔

۴۔ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۹، جلد دوم، ص ۲۳۵ کے مطابق "انا افصح العرب"

۵۔ تاریخ الادب العربی (ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی)، شیخ غلام علی، لاہور ۱۹۶۱، ص ۵۳-۵۲۔

۶۔ محمود شکری آلوسی نے بلوغ الارب (اردو ترجمہ و تحشیہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، مرکزی اردو بورڈ، لاہور) نے بھی عرب کے خطبائے عہد جاہلیت کا تذکرہ کیا ہے (ج ۳ ص ۱۹۸ - ۳۰۴)۔ فاضل مصنف نے بطور نمونہ ان کے چند خطبے بھی دیے ہیں، ساتھ ہی ابتدائی اسلام کے بعض خطبا کی تقریریں بھی درج کی ہیں۔

۷۔ محمود بن عمر زمخشری: الکشاف عن حقائق و غوامض التنزیل، مطبع مصطفیٰ محمد، ۱۳۵۷ھ، ج ۲، ص ۳۳۳

۸۔ محمد علی: بیان القرآن، مطبع کریمی لاہور، ۱۳۴۱ھ، ج ۲، ص ۱۰۹۸

۹۔ زمخشری، ایضاً، ج ۲، ص ۳۳۳

اظہار تعزیت

جماعت اسلامی لاہور کے رکن اور دینی اسلامک پبلشرز کے ڈائریکٹر محمد عثمان شمسی صاحب کے والد محترم حاجی محمد عمر صاحب نئی تال والے گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

ادارہ ترجمان القرآن محمد عثمان شمسی صاحب کے والد گرامی کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین